

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

محرّم مراد

آنکھ ہو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

عالم کا مستقبل آج اسلام کا ہے!

اگر کل یہ ایک خواب تھا، تو آج یہ بات عیاں ہے کہ اس خواب کے حقیقت بن جانے کی گھڑی بہت قریب آگئی ہے۔ کب؟ اس کا علم تو اسی وحدۃ لا شریک کے پاس ہے جس کے دست قدرت میں آسمان سے زمین تک ہر امر کی ہانگ ہے۔ اِنَّمَا عَلَّمَهَا حِنْدَ رَبِّیْ۔ لیکن جس کی نگاہیں تاریخ کے باطن میں جھانک سکتی ہیں، اور جو نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج آشنا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ گھڑی تَقَلَّتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، آسمان اور زمین اس سے پوچھ لیں (الاعراف ۷: ۱۸) کا مصداق بن چکی ہے۔

اس لیے کہ یہ نبوت محمدیؐ کا ناگزیر تقاضا ہے، اور اس کا ظہور پذیر ہونا اہل ہے۔ حضور جمیع انسانوں کی طرف، سارے عالموں کے لیے، اور رہتی دنیا تک کے لیے رسول، نذیر اور رحمت ہیں۔ اور ”اللہ تعالیٰ نے یہ لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول غلب ہو کر رہیں گے۔“ وقت لگ سکتا ہے، توشتہ الہی ٹل نہیں سکتا۔

اس لیے بھی کہ نبوت محمدیؐ کا مشن روزِ اول ہی سے عالمی انقلاب کی منزل رہا ہے۔ آمرؑ کے پیٹ سے نور کا نکلنا ہو جس نے ارضِ شام کو روشن کر دیا، یا ولادتِ نبویؐ کے وقت کسریٰ کے محل کا زمیں بوس ہونا، ہجرت کے پُر خطر سفر کی بے سروسلانی کے عالم میں شراقہ کو کسریٰ کے

کنگنوں کی بشارت ہو، یا غزوہ احزاب کے لیے خندق کھودتے ہوئے روم و ایران اور شام و یمن کی فتوحات کی نوید، شاہانِ عالم کی طرف قبولِ اسلام کے دعوت نامے ہوں، یا سلطنتِ روم سے جنگ کے لیے تیوک کا سفر۔۔۔ یہ سب اسی مشن کی آرزو، جستجو اور تکمیل کے مظاہر ہیں۔

اس لیے بھی کہ، حضورؐ کے بعد، آپؐ کے مشن کی امانت آپؐ کی اُمت کے سپرد ہے۔ اسی لیے اس اُمت کو اپنے لیے نہیں بلکہ ساری انسانیت کے لیے بنایا گیا ہے (أَخْوَجَتْ لِلنَّاسِ) 'محترم امت (مَحْمُودِ امَّةٍ) قرار دیا گیا ہے۔ رسولؐ کے بعد، رسولؐ کی طرح، انسانوں کے سامنے گواہ بنایا گیا ہے (لَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ) اور اللہ کی خاطر قسط و عدل قائم کرنے (كَلَامَيْنِ بِالْقِسْطِ) اور اس پر گواہ بننے (شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ) کا حکم دیا گیا ہے۔ لہذا عصرِ حاضر میں کارِ رسالت، اُمتِ مسلمہ کے ہاتھوں ہی انجام پانا ہے۔ وہ لوگ انجام دیں جن پر آج امت مشتمل ہے، یا اللہ تعالیٰ امت میں نیا خون داخل کرے، اور ان کی جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے، یہ کام ہر عمل انجام پانا ہے۔

ادھر خود عصرِ حاضر کی روح مضطرب اور بے تاب ہے کہ شرعِ پیغمبرؐ آشکارا اور غالب ہو۔ مغرب نے انسان کی بلوغت اور خود مختاری کا اعلان کیا، اس کو کسی بھی ہلاتر، اور بالخصوص خدائی ہدایت سے مستغنی قرار دیا، خدا کو پبلک زندگی سے بے دخل کیا۔۔۔ گویا انسان کو انسان کا خدا بنایا۔۔۔ اور بڑی محنت سے ایک نیا عالم تشکیل دیا۔ لیکن دو صدیاں بھی نہیں گزرنے پائی ہیں کہ آج وہ عالم پیر مر رہا ہے، اور انسان بے چینی سے ایک جہنمِ نو کی پیدائش کا انتظار کر رہا ہے۔ خدا سے مستغنی ہو جانے کے بعد، انسان نے اپنے دل و زندگی کو اور خدا کی زمین کو فساد اور خوں دیزی سے بھر دیا ہے۔ روزِ نت نئی خواہشات کی طلب ہے، ہر طلب میں روز بروز اضافہ ہے، ہر چیز زیادہ سے زیادہ چاہیے، اور جو کچھ چاہیے وہ جلد از جلد ملنا چاہیے۔ انسان ہوں یا ٹیکنالوجی، زمین ہو یا کائنات، ہر چیز صرف خواہشات پوری کرنے کا ذریعہ بن گئی ہے۔ ہر سینہ میں لالچ و حسد کی آگ جل رہی ہے۔ خدا کو بھول کر انسان خود اپنی بھلائی سے غافل ہو گیا ہے۔

زمین کے فاصلے سکڑتے جا رہے ہیں، مگر انسانوں کے درمیان نفرت اور لاتعلقی کی ناقابلِ عبور خلیجیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ یہ صدی انسانی تاریخ کی سب سے زیادہ خونی صدی ہے۔ پہلی جنگِ عظیم میں ۸۴ لاکھ، دوسری میں ۶ کروڑ، کوریا اور ویت نام جیسی مقامی جنگوں، انسانی جبر و استبداد کے ہاتھوں اور رنگ و نسل کے خداؤں کی خاطر، ان سے بھی کہیں زیادہ انسان موت کے گھاٹ اتارے گئے ہیں، اور ان سے کئی گنا زیادہ تعداد لاپتہ بنائی گئی ہے۔

انسان تاریخ میں پہلی دفعہ ایسے ہتھیاروں سے لیس ہے کہ ایک ہٹن دیا کر پوری نسلِ انسانی کو چشمِ زدن میں ہلاک کر سکتا ہے۔ خاندانی زندگی اس طرح ٹوٹ پھوٹ گئی ہے کہ صرف انگلینڈ میں ایک تہائی بچے شادی کے بغیر ناجائز پیدا ہو رہے ہیں، ۲۰ فیصد بچوں کا خاندانوں میں کوئی باپ نہیں ہے، آدمی عورتیں شادی سے پہلے اپنے شوہروں سے جنسی تعلقات قائم کر چکی ہوتی ہیں، ہر دوسری شادی کا انجام طلاق ہوتا ہے۔ بچوں اور نوجوانوں میں سنگین جرائم میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ بینکنگ کا نظام، جس کے بل پر معاشی ترقی قائم ہے، ایک بلبلے کی طرح ہے: آج جس بینک کے دروازے پر بھی سارے کھاتے دار اپنی رقم واپس مانگنے پہنچ جائیں، اس بینک کا دیوالیہ نکل جائے گا۔ بظاہر انتہائی محکم نظاموں میں بھی، سیاسی لیڈروں سے ایک عام مایوسی اور بد اعتمادی پیدا ہو چکی ہے۔ اپنی خواہشات کی بے لگام تکمیل کی دھن میں دنیا کے ماحول کو ایسا زبردست نقصان پہنچ رہا ہے جو عین ممکن ہے ناقابلِ تلافی اور تباہ کن ثابت ہو۔

دورِ جدید کے انسان کے اوپر ایسے بے شمار مسائل کا اتنا بھاری بوجھ ہے کہ کوئی تنکا بھی اس کی کمر توڑ سکتا ہے۔ ان مسائل کی جڑ خدا بیزار تہذیب ہے، اور انسانی زندگی میں جب خدا کا خانہ خالی ہوتا ہے تو اس میں بے شمار جھوٹے خدا براجمن ہو جاتے ہیں۔ پہلے یہ جھوٹے خدا بھی مافوق الانسانی صفات کے حامل سمجھے جاتے تھے، اور خدائے واحد کی قربت کا ذریعہ بھی۔ اب انسان نے اتفاق (chance) قانونِ قدرت، ذرائعِ پیداوار، جنس، سوسائٹی، کلچر، ٹیکنالوجی، نسل، رنگ، قوم، اور وطن جیسے بہرے، گوئے، بے جان بتان، تو کو اپنے مقدر کا مالک سمجھ لیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ روز بروز وہ تباہی کے گہرے سے گہرے گڑھے میں گرتا جا رہا ہے۔ اس سے نجات کی راہ صرف خدائے واحد ہی کو خدا اور رب بنانے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اسی سے وحدتِ انسان اور امن و سلامتی کی نعمتیں اس کو نصیب ہوں گی۔ اس لیے یہ کہنا بالکل بجا ہو گا کہ اب غلبہٴ اسلام کے بغیر عالم کا کوئی مستقبل نہیں۔

جادو وہ جو سرچڑھ کر بولے۔ خود مغرب، جو اس دورِ جدید کا معمار ہے، اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کا دور اب عالمِ پیر بن کر موت کے کنارے پہنچ چکا ہے، اور انسانیت ایک جہانِ نو کی تعمیر کے بغیر بچ نہیں سکتی۔ بڑے زور و شور سے ”نیو ورلڈ آرڈر“ کا نعرہ، مغرب کے اس اعتراف کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے۔

۱۱ ستمبر ۱۹۹۰ کو امریکی کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے امریکی صدر جارج بش نے کہا تھا: ”ہم آج ایک منفرد اور غیر معمولی تاریخی لمحے کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ خلیج کا بحران بلاشبہ بہت خطرناک

اور سمبیر بحران ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک نادر موقع بھی فراہم کر رہا ہے۔۔۔ ان آفت زدہ آیام کے غبار سے ہمارا پانچواں مقصد برآمد ہو سکتا ہے — یعنی ایک نیا عالمی نظام۔۔۔ اور ۶ مارچ ۱۹۹۱ کو خلیجی جنگ میں کامیابی کے فوراً بعد انھوں نے دعویٰ کیا کہ ”اب ہم ایک نئی دنیا کو اپنی آنکھوں کے سامنے ابھرتا دیکھ رہے ہیں۔“ اگست ۱۹۹۰ سے مارچ ۱۹۹۱ تک، صدر بش نے ۳۲ بار اپنے بیانون اور تقریروں میں پورے زور و شور سے اس جہانِ نو کی تعمیر کو مستقبل کی امریکی پالیسی کی اساس قرار دیا۔

مغرب اس نئی دنیا کی تعبیر بڑے خوش نما الفاظ میں کر رہا ہے۔ صدر بش کے الفاظ میں: ”ایک ایسا نیا دور، جو طاقت کے استعمال کے خطرات سے پاک ہو، جو انصاف کے قیام کے لیے قوی اور توانا ہو، اور جس میں امن و سلامتی کا حصول زیادہ ممکن ہو۔“ بظاہر تو مغربی لیڈر اور دانشور کہتے ہیں کہ یہ نئی دنیا اس لیے ناگزیر ہو گئی ہے کہ یورپ نے اقوامِ عالم کے درمیان تعلقات کا جو نظام بنایا تھا وہ ٹوٹ پھوٹ چکا ہے، نظریاتی کشمکش بھی ختم ہو چکی ہے، قومی ریاست بھی مائل بہ زوال ہے، کیونزیم بھی شکست کھا چکا ہے، نیوکلیر اسلحہ اور عسکری طاقت کے استعمال کا رجحان بڑھ رہا ہے، اور اس طرح امنِ عالم مسلسل بے دلا ہونے کے خطرے کی زد میں ہے۔

لیکن مغرب خوب جانتا ہے کہ اصل بات یہ نہیں، بلکہ انسانِ جہانِ نو کا ضرورت مند اس لیے ہے کہ مغرب کی بے خدا تہذیب اور اس کی عالمی قیادت اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہے، اور اس کی کوکھ سے اب انسان کے لیے دکھ و الم اور جہنمی کے علاوہ اور کچھ برآمد ہونے والا نہیں۔ اگر ۱۹۸۳ سے امنِ عالم بار بار بے دلا ہو رہا ہے، تو وہ بھی اسی تہذیب کی وجہ سے۔ چنانچہ اب انسان کو امن و انصاف حاصل ہو سکتا ہے تو صرف ایک ایسی تہذیب ہی سے جو خدائے واحد کی بندگی پر قائم ہو۔ برطانوی ہفت روزہ ”اکناسٹ“ کے الفاظ میں: ”مستقبل میں اگر کوئی تاریخ ساز واقعہ رونما ہوگا، تو غالباً ان امور کے گرد جو غیب میں ہیں، اور جن کے علمبردار اسلامی بنیاد پرست ہیں۔“ اس لیے جہانِ نو کی تعمیر و قیادت کے لیے اصل کشمکش مغرب اور اسلام کی اس خدا پرستانہ تہذیب کے درمیان ہوگی جو ہزار سال تک دنیا پر غالب رہی۔ اور تہذیبوں کے اس تصادم میں مغرب کی عالمی قیادت داؤ پر لگی ہوگی۔ ہمیں اتفاق ہے کہ مغرب کی لبرل ڈیموکری کی تاریخ ختم ہونے پر آگئی ہے، لیکن اب تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوگا، جو اسلام کا دور ہوگا۔

مغرب کے سیاستدان اور دانشور مستقبل کے پردے میں پنہاں اس تہذیبی تصادم کے امکان

سے خوب آگاہ ہیں اور اس کے لیے پوری تیاری کھ رہے ہیں۔

ایک طرف اس کا اظہار بعض دانشوروں کی حالیہ کتابوں اور مضامین کے انتہا پسند عنوانات سے ہوتا ہے: اسلام کی تلوار، اسلام کا خنجر، جاہلیت پسند اسلام، اسلام کا محظ و محض، مسلمان آئیے، مسلمان آئیے، ساتویں صدی کے بعد اسلام بھر مارچ کھدایے، وغیرہ وغیرہ۔

دوسری طرف سیاستدانوں اور لکھنے والوں کے اعلانات ہیں۔ بختان (Buchanan) لکھتا ہے: ”ہزار سال تک انسانیت کے مستقبل کے لیے کشش اسلام اور عیسائیت کے درمیان رہی ہے۔ اکیسویں صدی میں پھر یہی ہو سکتا ہے“ (نیو یارک ٹائمز، ۲۰ اگست ۱۹۸۹)۔ مرنی (Murphy) کے الفاظ میں: ”سرد جنگ کے بعد اگر مسلم دنیا تصادم کی نئی سرحد بنتی جا رہی ہے تو بات یہ نہیں کہ ان سے کسی جنگ یا دہشت گردی کا خطرہ ہے، بلکہ ان کا چیلنج کہیں زیادہ بنیادی ہے۔ وہ روز بروز بڑھتی ہوئی سلامتی اور سیاسی قوت ہیں جو مغرب کے مسئلہ تصورات پر حملہ آور ہیں: مثلاً ترقی کے معنی، خدا اور انسان کا تعلق، اور انسانی زندگی میں ٹیکنالوجی، صنعت کاری اور اخلاق کا مقام“ (لاس اینجلس ٹائمز، ۶ اپریل ۱۹۹۳)۔ مشہور یہودی مستشرق برنارڈ لیوس (Lewis) کی رائے میں: ”یہ اب واضح ہونا چاہیے کہ ہمیں ایک ایسی تحریک اور رویہ کا سامنا ہے جو مسائل اور ان پر کاربند حکومتوں کے ساتھ اختلاف کی سطح سے آگے جا چکا ہے۔ اب تو تہذیبوں کے تصادم سے کم کوئی چیز سامنے نہیں! یہ ایک دیرینہ حریف کا تاریخی ردِ عمل ہے، ہمارے یہودی / عیسائی ماضی کے، ہمارے لادینی حل کے، اور دونوں کی عالمی توسیع کے خلاف“ (ماہنامہ اٹلانٹک، اکتوبر ۱۹۹۱)۔

سیاست دان بھی کم صاف گو نہیں۔ سابق صدر، فکسن نے، ۱۹۸۵ میں، امریکی رسلے لادن المیز میں اپنے مضمون میں کہا تھا کہ روس اور امریکہ کو، اپنے تمام اختلافات کے باوجود، اسلامی بنیاد پرستی کا مقابلہ کرنے کے لیے باہمی تعاون کرنا چاہیے۔ سابق نائب صدر، ڈان کوئیل (Quayle) نے اسلامی بنیاد پرستی کے خطرے کو نازی ازم اور کمیونزم کے خطرے کے برابر قرار دیا۔ سابق صدر ریگن اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:

اسلامی بنیاد پرستی، جو لیبرل سیکولر حکومتوں کی دشمن ہے، دراصل اسلامی نظام کی علیبردار ہے۔ ... وہ اپنے پیروکاروں کو یہ سکھاتی ہے کہ وہ مخالف قوتوں سے لڑتے ہوئے مارے گئے تو شہید ہوں گے، اور سیدھے بالغ عدن میں جائیں گے۔ ... اگر اسلامی بنیاد پرستی کو عروج نصیب ہو گیا تو دنیا صدیوں پرانی رجعت پسندی سے دوچار ہو جائے گی۔

خصوصاً اگر ایٹمی اور کیمیائی اسلحہ ان مشتعل مزاج عناصر کے ہاتھ لگ گیا، اور انھوں نے اسے اپنے دشمنوں کے خلاف استعمال کرنا سیکھ لیا۔

نئے عالمی نظام کی حسین تصویر کے پیچھے اس کے اصل غد و غل بھی کوئی ڈھکے چھپے نہیں۔

۱۔ دنیا کے تمام ملکوں کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ امریکہ دنیا کی واحد عالمی طاقت ہے۔ امریکہ کا یہ ہدف ہو گا کہ وہ اپنے اس مقام کو برقرار رکھے۔

۲۔ مغرب کے لبرل ڈیموکریسی اور منڈی کی معیشت جیسے تہذیبی تصورات کی حتمی فتح کے بعد، تاریخ نے اپنی منزل پالی ہے۔ اب دنیا کے ہر ملک کو انھی کو اختیار کرنا ہو گا۔

۳۔ اب کسی بھی ملک کو، خصوصاً کسی مسلمان ملک کو، یہ موقع نہیں ملنا چاہیے کہ وہ بالاتر سیاسی قوت کی حیثیت سے ابھر سکے۔

۴۔ تیسری دنیا میں، خصوصاً خلیج فارس میں، امریکی مفادات کا ہر قیمت پر تحفظ کیا جائے گا۔

۵۔ پوری دنیا میں احیائے اسلام کی تحریکوں کی مخالفت کی جائے گی۔

کوئی تعجب نہیں کہ آنے والے دور کا نام ”امریکی صدی“ American Century رکھا جا رہا ہے۔ ایک برطانوی مقالہ نگار ڈیوڈ مارکوانڈ (Marquand) کے الفاظ میں: ”جس نئے عالمی نظام کی دھوم ہے وہ صرف امریکی نظام Pan Americana ہی ہوتا نظر آ رہا ہے“ (کارجن، لندن)۔ اور ایک امریکن مقالہ نگار بڑی ڈھٹائی سے کہتا ہے: ”اس نظام میں امریکہ کی حیثیت وہی ہوگی جو قرون وسطیٰ کے جاگیردارانہ معاشرہ میں بادشاہ کی ہوتی تھی“ (نیشنل ریویو)۔

بظاہر، امت مسلمہ اور مسلمان ملکوں کا ترقی یافتہ مغرب اور امریکہ سے کیا مقابلہ!

نہ عسکری قوت اور اسلحہ میں دونوں میں کوئی تناسب اور مقابلہ ہے، نہ دولت اور معیشت میں، نہ علم اور تحقیق میں، نہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں، نہ دنیا چلانے کی مہارت و صلاحیت میں۔ ہمارے اوپر ان کا غلبہ مکمل ہے۔ ہمارے حکمرانوں کو وہ اٹھاتے بٹھاتے ہیں، ہماری فوجیں اسلحہ کے لیے کھینچتا، ان کی دست نگر ہیں، ہماری حکومتیں اور ان کے معاشی ترقی کے پروگرام ان کے قرضوں سے چلتے ہیں۔ معاشی ترقی کے تصورات اور ماڈل، اور اس کو جانچنے کے پیمانے بھی، ہم نے ان سے قرض لیے ہیں۔ ہمارے بچے ان کی وضع کردہ تعلیم حاصل کرتے ہیں، بلکہ بکثرت انھی کی زبان میں کرتے ہیں۔ ہمارا میڈیا ان کی فراہم کردہ خبریں اور پروگرام نشر کرتا ہے۔ ہمارے ادارے، دستور، پارلیمنٹ، بینک، مارکیٹ، کارخانے، اسکول، یونیورسٹیاں، سب ان کے تصورات

اور نقشے کے مطابق بنے ہیں۔ یہاں تک کہ ہر جگہ ان کے کوکا کولا اور جین کا بھی غلبہ ہے۔ دوسری طرف ہم اندر سے بے انتہا کمزور ہیں۔ دل، مقصد، آرزو و جستجو، ذوقِ عمل اور نشاطِ کار سے خالی ہیں۔ اخلاق و کردار پست ہو چکے ہیں۔ امت کا جسدِ تفرقہ اور انتشار کا شکار ہے۔ سماجی بدعنوانی ڈھیلے ہو رہے ہیں۔ رشوت اور بدعنوانی دیمک کی طرح چاٹ گئی ہے۔ اپنا سیاسی نظام چلانے سے، اور بحسن و خوبی اپنے ملک کا انتظام و انصرام کرنے سے عاجز ہیں۔ ہمارے حکمران بھیرِ قسمہ پاکی طرح ہماری گردنوں پر مسلط ہیں۔ نہ ہم ان کی گرفت سے اپنے کو چھڑا سکتے ہیں، نہ انھیں ہمارے علاوہ کوئی ملتا ہے جس کے اوپر وہ اپنا شوقِ فرمانروائی پورا کریں۔ عام مسلمان عزت و شرف کے تحفظ سے، بنیادی حقوق سے، امن و چین سے محروم ہیں۔ ان کو اللہ کی بخشی ہوئی صلاحیتیں ضائع جاری ہیں۔

دیکھنا ہو تو اپنے ملک عزیزِ پاکستان ہی کو دیکھ لیجیے۔ نصف صدی سے ہمیں سیاسی استحکام نصیب نہیں۔ سیاسی لیڈر بالعموم نہ صرف نااہل ہیں، بلکہ بکاؤ مال بھی۔ ہماری فوجیں دشمن کو فتح کرنے کے بجائے اپنے ملک ہی کو مفتوح بناتی رہتی ہیں۔ ملک کا بیل بیل قرض میں جکڑا ہوا ہے۔ جو بچہ پیدا ہوتا ہے ۸۷ ہزار روپے کا مقروض ہوتا ہے، اور ملک کا ۴۲ فیصد بجٹ سود اور اصل چکانے کی نذر ہو جاتا ہے۔ فوج اور انتظامیہ کو ۳۶ اور ۱۱ فیصد دینے کے بعد، صرف ۱۱ فیصد رقم قوم کی فلاح و بہبود کے لیے بچتی ہے۔ نظامِ تعلیم نے قوم کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ دفتروں میں، اور عدالتوں میں عوام کے معاملات اس ذہن میں پھٹائے جاتے ہیں جس کو وہ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ تیسری طرف امریکہ ہماری رہی سہی قوت کو ختم کرنے کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے میں تیزی سے مشغول ہے۔ مشرق وسطیٰ کا بددوست وہ کرچکا ہے۔ کیمپ ڈیوڈ کے ذریعہ مصر کا بددوست کیا، ایران / عراق جنگ سے ایران کو کنارے لگایا، عراق کو کھیت سے لڑایا، اسی ہمارے سعودی عرب اور کھیت کی دولت کو اپنے پاس رہن کر لیا، (خلیجی جنگ میں عربوں کے اخراجات کا اندازہ ۶۵۰ ارب ڈالر ہے) یا سرعرات کو اسرائیل کے دوش بدوش کھڑا کیا۔ اب اردن، شام اور دیگر عرب ممالک بھی یہی کرنے والے ہیں۔ ترکی پہلے ہی دام میں ہے۔ پاکستان کو بھی چارہ ڈالا جائے گا۔ ایران اور سوڈان کے گرد بھی جل بنا جا رہا ہے۔ وسطی ایشیا کے مسلم ملکوں کو سنبھلنے ہی نہیں دیا جا رہا۔

جب اُمتِ مسلمہ کا حال اتنا زہون ہے تو ہماری بریلوی کے مشورے اتنے زور و شور سے ان کے ابوانوں میں کیوں ہیں؟ گربہ کشن روزِ اول کی پالیسی بھی ایک وجہ ہے۔ لیکن جو خطرہ مغرب

کے کار فرماؤں کو یقین دلایا ہے کہ فتنہ فردا اسلام ہے جس کی آج ہی سے سرکوبی ضروری ہے۔ وہ اھیائے اسلام کی عالمی لہر ہے۔ وہ یہ ہے کہ دنیا کا ہر پانچواں آدمی مسلمان ہے اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں اسلامی تحریکات اس انبوعہ عظیم کو اسی راستے کی طرف دوبارہ لے جا رہی ہیں جس میں اس کی زندگی کا سامان ہے (دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ) اور وہ خطرہ خود مغرب کے قلب میں اُمت کی روز بروز بڑھتی ہوئی طاقت ہے۔

مغرب کے بچے سے نکلنے کا راستہ کیسے بنے گا؟ بظاہر مغرب کا تسلط مکمل ہے اور ان کی چالیں کامیاب۔ لیکن مغرب کی کشتی خود بھنور میں پھنسی ہوئی ہے اور مغرب کو اس کا پورا احساس ہے۔ و مَكْرُوا وَمَكْرُوهٌ (انہوں نے اپنی تدبیریں کیں، اللہ نے اپنی) کا وعدہ پورا ہونے کا جب وقت آئے گا تو ان شاء اللہ اسی بھنور میں سے جہانِ نو کی پیدائش کا سامان ہوگا:

ہوائیں ان کی، قضائیں ان کی، سمندر ان کے، جہاز ان کے
گرہ بھنور کی کھلے تو کیوں کر؟ بھنور ہے تقدیر کا بہانہ

کیا ہم آج کے ”منفرد اور غیر معمولی تاریخی لمحے“ کے چیلنج کا اور اک رکھتے ہیں اور اس سے حمدہ برآ ہونے کی سعی کر رہے ہیں؟ ہماری رائے میں اس چیلنج کے چند اہم پہلوؤں کا ذکر یہاں ضروری ہے۔

اُمت اور اسلامی تحریکات کے سامنے سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ وہ انسانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو جو تجدید استطاعت صالحیت و صلاحیت کے حامل ہوں، مستقبل کے لیے جدوجہد کی خاطر کھڑا کر دیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و ہدایت کے بعد کامیابی کے لیے سب سے زیادہ ضرورت انسانوں کی ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں مسلمان اور اسلامی تحریکات انسانوں تک پہنچنے میں ان کو اپنے ساتھ لے کر چلنے میں ساتھ چلنے والوں کا تزکیہ کرنے اور ان کو باصلاحیت بنانے میں عام انسانوں کی تعلیم و تربیت کرنے اور ان میں شریعت کا بار اٹھانے کی استعداد پیدا کرنے میں اُمت مسلمہ میں ہی سے نہیں ہر انسانی معاشرہ میں سے صلاح و خیر کی وہ آخری رمت حاصل کر لینے میں جو ظلم و فساد ختم کر کے نظامِ حق و قسط قائم کرنے کے کام آ سکے اور دستیاب انسانی وسائل کا صحیح اور بھرپور استعمال کرنے میں کما حقہ کامیاب نہیں ہیں۔ اس اہم ترین چیلنج کے بارہ میں بہت کچھ سوچنا اور بہت کچھ کرنا ضروری ہے۔

اس چیلنج کا جواب دیے بغیر حکمتِ عملی اور تدبیرِ کار کے بارہ میں اکثر بحثیں ثانوی حیثیت

رکھتی ہیں، گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنے کے مترادف ہیں: انقلاب یا اصلاح، پہلے معاشرہ یا پہلے سیاسی جدوجہد، انتخابات یا جدوجہد، وغیرہ وغیرہ۔ جو حکمت عملی بھی اختیار کریں، انسان درکار ہوں گے، ان کا صحیح اور بھرپور استعمال ضروری ہوگا۔ ووٹ دینا ہوگا تو انسان دیں گے، سڑکوں پر آنا ہوگا تو انسان آئیں گے، لڑنا ہوگا تو انسان لڑیں گے۔ کیونکہ ہم انسانوں کی مطلوب تعداد کو ساتھ لے کر چلنے میں کامیاب نہیں، اس لیے ان لامحالہ بحثوں سے دل بھلاتے رہتے ہیں۔ ایک دفعہ انسان فراہم ہو جائیں گے، تو جو تدبیر اختیار کریں گے اس کے لیے درکار دیگر وسائل بھی فراہم ہو جائیں گے۔ تدبیر وہی اختیار کرنا ہوگی جو زمانہ میں رائج ہے، 'إلا یہ کہ حکم الہی کے خلاف ہو' یا یہ کہ ہم اجتہاد سے نئی راہیں کھولیں۔

یہ تصور بھی صحیح نہیں کہ انبیائے کرام کا کوئی لگا بندھا طریق کار رہا ہے۔ اگر کوئی لگا بندھا طریق کار رہا ہے، وہ بس دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تزکیہ کے ذریعے لوگوں کے دل اور زندگی بدلنے اور جدوجہد کرنے کا رہا ہے۔ دعوت و تبلیغ، تعلیم و تزکیہ اور جدوجہد کے لیے موزوں تدابیر، وہ بھی اپنے حالات کے لحاظ سے اختیار کرتے رہے، ہم بھی کر سکتے ہیں۔

یہ تصور بھی صحیح نہیں کہ آج کوئی دور بالکل نئی یا مٹی دور کی طرح ہو سکتا ہے: ہر دور منفرد بھی ہوتا ہے، اور قشabh بھی۔ یہ انسانی عقل کا امتحان ہے کہ وہ اپنے دور کو سمجھے، اپنے معاشرہ کو سمجھے، اور قرآن مجید، 'أُسوة نبوی' اور 'أُسوة انبیائے کرام' کی روشنی میں اپنے لیے راہِ عمل متعین کرے، لیکن ہر راہِ عمل کا مقصد انسانوں کو جمع کرنا، ان کو قوت بنانا اور ان کے ذریعہ جدوجہد کرنا ہی ہونا چاہیے۔

انسانوں کو ساتھ لینا ہو تو چند اصول ملحوظ رکھنا ناگزیر ہے۔

ایک یہ یقین ضروری ہے کہ ہر انسان بدل سکتا ہے، ہر بدکار نیکوکار بن سکتا ہے، ہر کافر مسلمان ہو سکتا ہے، ہر مخالف ساتھ آ سکتا ہے۔ جب تک کوئی 'اتمامِ حجت ہونے کے بعد' (جس کا تعین کرنا بہت مشکل ہے) انکار نہ کرے، اس کی اصلاح سے مایوس ہونا جائز نہیں۔

دوسرے یہ کہ ہر انسان کو خالق نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے، اس میں اپنی روح پھونکی ہے، اس کے اندر بے پناہ صلاحیتیں اور ترقی کے بے پناہ امکانات رکھے ہیں۔ انسان کو حقیر نہ سمجھنا، اس کی کمزوریوں سے زیادہ خوبیوں پر نظر رکھنا، اس کی قدر کرنا، یہ اس راہ میں مطلوب ہے۔

تیسرے یہ کہ جو انسان بدلیں گے اور ساتھ آئیں گے، وہ کبھی سر تپا ہمارے بیٹانوں پر پورا نہیں اتریں گے، نہ ہماری ساری توقعات پوری کریں گے۔ جو مزاج اور خیال کا اختلاف برداشت

نہیں کر سکتے، یا انسانوں کے ضعف، کوتاہیوں، گناہوں اور لغزشوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں، ان کے لیے انسانوں کو ساتھ لے کر چلنا بہت مشکل ہے۔ انسان سب ایک خیال کے نہیں ہو سکتے، سب کسی ایک معیار پر پورے نہیں اتر سکتے۔ جو ہٹنا آئے، ہٹنا کرے، اسے قبول کر کے اس کو بہتر سے بہتر بنانا ہی نبی کریمؐ کا اسوہ رہا ہے۔

چوتھے یہ کہ انسان کی زندگی کی کنجی اس کا دل ہے۔ دل کے قفل کھل جائیں گے، اصلاح کے راستے کھل جائیں گے۔ دل دیکھنے لگے گا، آنکھیں دیکھنے لگیں گی۔ دل کا مرض شفا یاب ہوگا، اخلاق و اعمال اور معاشرے صحت مند ہو جائیں گے۔

پانچویں یہ کہ بہت تھوڑے انسانوں کے دل نظریہ، تقریر، یا کتب سے جیتے جاسکتے ہیں۔ اصل فاتحِ عالم محبت ہے، دل کی نرمی ہے، گفتگو کی شیرینی ہے، اخلاق کا حسن و جمل ہے، فیاضی اور سخاوت ہے، خود درگزر ہے، غصہ، حسد اور کینہ وغیرہ سے پاک دل ہے۔

انسانوں کو ساتھ لینے اور ساتھ رکھنے کے لیے دین کے چند اور بنیادی اصول سیکھ کر ان پر کاربند رہنا بھی ضروری ہے۔ دین یسر ہے: دین کو آسان، مشکل اور تنگ نہ بنانا، طبیعتوں کو دین کی طرف مائل کرنا، متغیر نہ کرنا، انسان ضعیف کے اوپر بوجھ ہلکے کرنا، اس پر استعداد سے زیادہ بوجھ نہ رکھنا، مطالباتِ دین پیش کرنے میں تدریج اختیار کرنا، غلو، تشدد اور تعصب سے اجتناب کرنا کہ ان سے انحراف پیدا ہوتا ہے۔ — یہ تفسرِ دین کے چند پہلو ہیں۔ اعمال کو ان کے اصل مدارج پر قائم رکھنا، فرض کو فرض کی جگہ اور مباح کو مباح کی جگہ، مباح اور حلال کو حرام نہ کرنا، نفل کو فرض کا درجہ نہ دینا، اپنے اجتہاد کو اور فہم کو فحشاءِ الہی یا نصوص کا درجہ نہ دینا، ایک کام کرنے کے دو طریقے ہوں تو آسان طریقہ اختیار کرنا۔ — یہ بھی اس زمرہ میں آتے ہیں۔

وسیع پیمانہ پر عامۃ المسلمین کی دینی اور اخلاقی تعلیم و تربیت کے بغیر معاشرہ میں یہ استعداد نہ پیدا ہوگی کہ اس پر احکامِ الہی نافذ کیے جاسکیں، نہ عام لوگ دین کی نصرت میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے آگے بڑھیں گے۔ چنانچہ اس تعلیم و تربیت کے لیے کثرت سے موثر اقدامات کرنا ضروری ہیں۔

دوسرا اہم چیلنج یہ ہے کہ ہمیں مستقبل اپنا بنانے کے لیے ایک انتہائی تیز رفتاری سے بدلتے ہوئے زمانہ پر اپنی گرفت قائم کرنا ہے۔ اس تبدیلی کی باگ بھی ہمارے ہاتھ میں نہیں، مغرب کے ہاتھ میں ہے۔ جیٹ اور وٹش ایشیا کے ذریعہ روز بروز سکڑتے ہوئے فاصلوں کی دنیا میں، ہر تبدیلی

— وہ ٹیکنالوجی کی ہو، فکر و اخلاق کی ہو، فیشن کی ہو — ”آنا“ ”فانا“ دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل جاتی ہے۔ ہر تبدیلی کے آگے بند پاندھنا بہت مشکل ہے، ان کی جت بدلی جاسکتی ہے۔ ان حالات میں زمانہ کی باگ ہاتھ میں لینا اور مستقبل کی نقشہ گری کرنا ہر پہلو سے زبردست مجتہدانہ صلاحیت کا تقاضا کرتا ہے۔ ایسی مجتہدانہ صلاحیت کے بغیر نہ ایک تہذیب نو کی تعمیر ہو سکتی ہے، نہ امامتِ عالم حاصل ہو سکتی ہے۔

تیسرا اہم چیلنج عورت اور نوجوان کا ہے۔ ان تبدیلیوں سے دونوں سب سے بڑھ کر متاثر ہو رہے ہیں۔ عورت مستقبل کا ہر اول دست ہے، وہی ہمارے دین کی آخری پناہ گاہ ہے، وہ ہماری امت کا نصف حصہ بھی ہے۔ اس کو دین کی حدود میں، معاشرہ میں اس کا صحیح مقام دیے بغیر، کیا ہم صرف ایک پیہ سے مستقبل کی منزل پر پہنچ سکتے ہیں؟

یہی معاملہ نوجوانوں کا ہے، جو فطرتاً ہر نئی چیز قبول کرنے کے لیے آمادہ رہتے ہیں۔ جس کے بن جائیں، اس کے لیے سر دھڑکی بازی لگا دیتے ہیں، آسمان سے تارے فوج لاتے ہیں، پاتال میں اتر جاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے امتِ مسلمہ میں ۳۰ سال سے کم عمر کے نوجوان ۶۰ فیصد ہیں، جب کہ ۱۹ سال سے کم عمر بچوں کی تعداد ۵۰ فیصد ہے۔

آخری اہم چیلنج مغرب میں اسلام اور مسلمان کا ہے، مغرب کے اندر سے صلاح و خیر کی تمام ممکن قوتوں کو جمع کر کے ان کا وزن اسلام کے پلڑے میں ڈالنے کا ہے۔

مستقبل میں اسلام اور مغرب کی اصل جنگ، زمینی سرحدوں پر علاقے جیتنے سے پہلے، انسانی سرحدوں پر دل اور دماغ جیتنے کے لیے ہوگی۔ اس جنگ میں کامیابی ہی پر آنے والے معرکوں کے نتائج کا انحصار ہوگا۔ مغربی تہذیب اگلے اگلے مورچے عرصہ سے مسلم دنیا کے قلب میں — جکارتا، کراچی، ریاض سے لے کر رباط تک — قائم ہیں۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ گزشتہ نصف صدی میں اب اسلام کی آخری سرحد بھی ایک دفعہ پھر عین مغرب کے قلب میں پہنچ گئی ہے۔ مشرقی یورپ میں مسلمانوں کی بڑی آبادیاں موجود تھیں، لیکن اب لندن سے لے کر لاس اینجلس تک بھی ان کی بڑی بڑی آبادیاں وجود میں آچکی ہیں۔ کئی ممالک میں اسلام دوسرا بڑا مذہب بن گیا ہے یا بننے والا ہے۔ اسپین کے اور مشرقی یورپ میں عثمانی خلافت کے بعد ۱۳۰۰ سال میں یہ تیسرا تاریخی لمحہ ہے جو اسلام کو مغرب تک پہنچانے کے بھرپور امکانات کا حامل ہے۔

اگرچہ اب مسلمانوں کی پشت پر اسپین کی خیرہ کُن تہذیب نہیں، عثمانیوں کی لرزہ برانداز

کرنے والی فوجی قوت بھی نہیں، لیکن وہ غیر مسلم سوسائٹی کی غالب اکثریت کے پڑوسی ہیں، ان کے ساتھ ساتھ پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، کام کاج اور کاروبار کرتے ہیں، جو شہری ہیں وہ ووٹ بھی دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ وہاں اسلام کے سفیر بن کر نہیں گئے، نہ اچھے سفیر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ لیکن کوئی تصور نہ کر سکتا تھا کہ نصف صدی میں برطانیہ، امریکہ اور یورپ میں بے شمار مساجد موجود ہوں گی، تعلیم قرآن کے مدارس ہوں گے، بعض مقلات پر سڑکوں پر اذان بھی سنی جاسکے گی، اور بے شمار حلقوں کے اجتماعات میں ان کا ووٹ فیملہ کن بن جائے گا۔ یہ صرف مشیتِ الہی ہی سے ممکن ہوا ہے۔

مغرب کے مسلمان اکثر باہر سے آئے ہیں، لیکن اب خود اندر سے مقامی لوگوں کے ملت اسلامیہ میں شامل ہونے کی رفتار برابر بڑھ رہی ہے۔ ان میں عام لوگ بھی ہیں اور نمایاں شخصیتیں بھی، مرد بھی ہیں اور ان سے دینی تعداد میں عورتیں بھی (اس پروپیگنڈہ کے باوجود کہ اسلام عورت کو پست مقام دیتا ہے اور گھر اور حجاب میں قید کر دیتا ہے)۔

مسلمانوں کی اس بڑھتی ہوئی تعداد نے اٹلی، مغرب کو تہذیب و رواداری، انصاف و حریت اور انسان دوستی کے سارے نقاب چاک کر کے اصل چہرہ دکھانے پر مجبور کر دیا ہے۔ برطانوی وزیر داخلہ کا اصرار ہے کہ مسلمان بائبل اور شکسپر کو بھی اپنائیں، فرانسیسی وزیر داخلہ طالبات کو اسکولوں میں سر پر رومل باندھنے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں۔ انگلینڈ میں لڑکیوں کو شلوار پہننے کی اجازت دینے پر اسکولوں کے باہر مظاہرے ہوتے ہیں، مسجدوں میں سور کے سر بھی پھینکے جاتے ہیں۔ جرمنی میں مسلمانوں کو گھروں میں زمرہ جلا دیا جاتا ہے۔ بوسنیا کا حشر بھی سامنے ہے۔

یہ ایک تاریخی موقع ہے، اور اُمتِ مُسلّمہ کو اپنی اس آخری سرحد پر، جو مغرب کے قلب میں واقع ہے، دلوں اور دماغوں کے لیے بڑا جنگ جیتنے، تعصب اور نفرت کی دیواریں ڈھلنے، اور قرآن اور نبوت کا پیغام پھیلانے کے لیے تمام ممکن اقدامات کرنے کے منصوبے بنانا چاہئیں۔ اکثر لوگ اسلام سے ناواقف ہیں — اور یہی تعصب و نفرت کی بڑی وجہ ہے — ان کی تلاوتِ فیت دور کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا چاہیے۔ لوگوں کے ذہنوں میں غلط تصاویر بٹھادی گئی ہیں، ان کو صاف کرنا چاہیے۔

یہی معاملہ ہندوستان، چین، جاپان اور دیگر ممالک کا ہے، جہاں مسلمان بڑی تعداد میں موجود ہیں، یا جہاں اسلام سے صرف تلاوتِ فیت ہے، تعصب، نفرت اور دشمنی نہیں۔ یہاں بھی اگر اسلام کا پیغام پہنچے گا، تو ممکن نہیں کہ دلوں کو مسخر نہ کرے۔

جو ممالک مسلمانوں اور اسلام سے نہر آزما ہیں، ان کے بارہ میں بہت سوچ سمجھ کر مناسب حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ عداوت کا دائرہ پھیلنے نہ پائے: حکومت اور ملک، حکمرانوں اور عوام کے درمیان امتیاز رکھا جائے۔ خود ان ممالک کی رائے عامہ کو اپنے حکمرانوں کے خلاف کھڑا کیا جائے۔ جب تک ہم معرکہ جیتنے کی پوزیشن میں نہ ہوں معرکہ برپا نہ کیا جائے۔ نہ مقابلہ میں غیر مطلوب شدت پیدا کی جائے۔ ہمارے اہداف ہماری نظروں میں واضح ہوں اور ہم صبر سے ان کے لیے کام کرتے رہیں، جذبات میں ادھر ادھر نہ نکل جائیں۔

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہو گا، یہی ہے اک حرفِ محرمات

قریب تر ہے نمود جس کی، اسی کا مشتاق ہے زمانہ

مستقبل یقیناً اسلام کا ہے، اور ہم بلاشبہ آج "ایک منفرد اور غیر معمولی تاریخی لمحے کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔" لیکن تقدیر کے اس فیصلے نے امتِ مسلمہ اور اسلامی تحریکات کو ایک عظیم امتحان سے دوچار کر دیا ہے۔ اس لیے کہ مستقبل، من و سلوئی کی طرح، کسی قوم کی گود میں نہیں ٹپک پڑتا۔ مستقبل، ارادہ اللہ اس جدوجہد سے حاصل ہوتا ہے، جو عزم و جزم، حکمت و تدبیر اور ہمت و حوصلہ سے کی جائے۔

اس جدوجہد کے لیے قوت کا سرچشمہ اعتصام باللہ کے سوا کچھ نہیں۔ ضروری ہے کہ جدوجہد کرنے والے اپنے اندر، جتنی ممکن ہو، گہری تلقینت پیدا کریں: وہ جو کام کریں صرف اللہ کے لیے کریں، اٹھتے بیٹھتے اللہ کو یاد رکھیں، ان کے دل اللہ اور رسول کی محبت سے سرشار ہوں، ان کے ہر حکم پر لبیک کہیں، وہ دل و جان سے ان کے دقلدار ہوں، صرف اللہ کو فاعل حقیقی اور کارساز سمجھیں، اور ہر وقت اس سے ملاقات کی تیاری کرتے رہیں۔ اور اسی کی خاطر، مسلمانوں سے محبت کریں، ان کے حقوق ملحوظ رکھیں، اور آپس میں بنیانِ مرموص بن جائیں۔

اتنا ہی ضروری یہ بھی ہے کہ وہ وسیع پیمانہ پر امتِ مسلمہ اور ساری انسانیت کے اندر بھی گہری تلقینت پیدا کرنے کو اپنا کام سمجھیں۔ ان کو صحیح تعلیم دیں، ان کا تعلق اللہ کے ساتھ جوڑا جائے، ان کے دلوں میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت پیدا کریں، انہیں اطاعتِ الہی کے لیے تیار کریں، ان کے دلوں میں اللہ کی طرف بھاگنے کی تڑپ پیدا کریں، اور جس جنت کی وسعت میں زمین و آسمان سا جائیں اس ہی کی طرف دوڑ بھاگ اور مسابقت کا جذبہ غالب کریں۔

جنت اگر مطلوب ہے، تو جنت کی وسعت کے لحاظ ہی سے، دلوں میں وسعت، خیالات میں

وسعت، نگاہوں میں وسعت، مقاصد میں وسعت، رویوں میں وسعت، اور اللہ کے لیے زیادہ سے زیادہ لٹانے اور مٹانے میں وسعت — یہ وسعت دنیا اور آخرت میں اپنے مقصود کے حصول کے لیے ناگزیر ہے، جدوجہد کرنے والوں میں بھی، تمام مسلمانوں میں بھی۔

آج دنیا میں ہر پانچواں آدمی مسلمان ہے۔ ہم بہترین انسانی اور مادی ذخائر کے مالک ہیں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے بہترین دل و دماغ اور صلاحیتیں بخشی ہیں، ہماری زمینیں سونا اگلتی ہیں، اور ہر قسم کی معدنیات سے مالا مال ہیں۔ تمام بڑی اور بحری راستے ہمارے علاقوں سے گزرتے ہیں۔ ایک دفعہ اگر اس امت کے جسد میں نبوتِ محمدیؐ کے مشن کی روح پیدا ہو جائے، تو وہ انسانیت کو اپنے لیے منظر پائے گی۔ مگر امت کا حل یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام زبان پر ہے، دل اور زندگیوں ان سے وفاداری سے خالی ہیں۔ انسانیت کی غالب اکثریت نے تو یہ نام سنا ہی نہیں، یا سنا ہے تو سننے کا حق نہیں ادا ہوا ہے۔ مسلمان کا راستہ بالکل واضح ہے:

بے خبر! تو جوہرِ آئینہ، ایام ہے تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

ان شاء اللہ العزیز اس کا وعدہ علو و استخلاف پورا ہو کر رہے گا۔
أَقُولُ قَوْلِي هَذَا وَالْوَعْدُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ

ترجمینِ نوب کے بعد، ترجمان القرآن کے دوسرے دور کا پہلا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس دورِ نو میں ہماری تمام تر کوشش یہ ہو گی کہ ترجمان کے صفحات اس ایجنڈے کی تکمیل کے لیے وقف رہیں جس کو ہم نے جامع طریقہ سے اوپر بیان کرنے کی کوشش کی ہے، کہ آج کی ضرورت یہی ہے۔ یعنی موجودہ عالمی کشمکش میں مسلمان دنیا کے مستقبل کی نقشہ گری کر سکیں۔

فیم قرآن کے تحت آپ مستقبل کے بارہ میں ان بشارتوں کی روشنی دیکھیں گے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو دیں۔ یہ بشارتیں بھی ہیں، آپؐ کے مشن کا بیان بھی۔ حضورؐ کی